طنز و مزاحیہ ادب میں تحریک علی گڑھ کا حصہ

Contribution of Aligarh movement in satirical literature

شہلا گل
پی ایچ۔ڈی، اسکالر، شعبہ اُردو، نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ
ڈاکٹر سید طاہر علی شاہ
صدر شعبہ اُردو، نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ
محمد ظہور خان
استاد (اردو) شہید بے نظر بھٹو یونیورسٹی شرینگل دیر

Abstract

Satirical and humorous literature, when presented in an effective and humorous form, creates insight and wisdom in the minds. Social, economic and political problems can be easily conveyed to others through humor. The Aligarh Movement adopted a serious and realistic style of writing. There, in some cases, he also adopted satirical and humorous style. In this article, the satirical literature of the Aligarh movement has been discussed in order to bring out the humorous aspects of this universal movement.

Keywords: Satirical and humorous literature, easily conveyed, style of writing, humorous aspects, universal movement.

کلیدی الفاظ: طنز و مزاح، عناصر خمسہ، ریختی گوئی، عصری حالات، شگفتہ بیانی، سلگتے مسائل

ادب کی شناخت شاعری اور نثر سے ہوتی ہے۔ زبانوں کے ادب کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس میں سب سے پہلے شاعری کو فروغ حاصل ہوا اور اس کے بعد نثر نگاری نے اپنے وجود کو منوایا۔ اُردو ادب میں بھی اس نظریہ کا اطلاق نہ صرف اُردو شاعری پر ہوتا ہے بلکہ اُردو نثر نگاری میں طنز و مزاح کی روایت پر بھی ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو میں طنز و مزاح کی روایت بھی ابتدا میں شاعری کے ذریعہ فروغ پائی اور پھر رفتہ رفتہ نثر میں بھی طنز و مزاح کو مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ شاعری میں طنز و مزاح کی روایت قدیم ہے۔ اُردو ادب کے آغاز کے ساتھ ہی طنزیات و مضحکات کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔

طنز و مزاح کے حوالے سے سب سے پہلا نام جعفر زٹلی کا ہے جن میں غیر معمولی تہذیبی شعور اور ثقافتی حیثیت موجود تھی۔ اُن کا شمار اُردو کے ابتدائی "شہر آشوب" لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اُردو طنز و مزاح کی روایت کو پروان چڑھانے میں بھی نمایاں کام کیا۔ اُن کے بعد سودا نے "ہجویات" لکھ کر طنز و مزاح کو اپنی شاعری کا اہم جزبنایا۔ ان کا مشہور قصیدہ "تضحیک روز گار" بظاہر مزاح پر مبنی ہے لیکن اس میں سودا نے اپنے دور کے فوجی نظام پر طنز کیا تھا۔ سودا کے بعد میر ضاحک، انشاء، جرات" وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں کہیں کہیں مزاح کو اپنایا ہے۔ دکن میں بھی عادل شاہی اور قطب شاہی شاعروں قطبی اور غواصی وغیرہ نے اپنی شاعری میں مزاح سے کام لیا ہے۔ ہجویہ قصیدوں اور شاعرانہ چشمکوں کے دوران لکھے جانے والے اشعار میں بھی طنز و مزاح کی روایت نظر آتی ہے۔ لکھنو کے شاعروں نے "ریختی گوئی" کے ذریعہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو فروغ دیا لیکن اس شاعری میں عامیانہ پن غالب تھا۔ طنز و مزاح کے ذریعہ مقصدی شاعری کی باضابطہ روایت منشی سجاد حسین کے اخبار "اَودھ پنچ" سے نظر آتی ہے۔ جس کے قلم کاروں نے مشرقی تہذیب اور اخلاق کی حمایت کی اور مغربی تہذیب کے علاوہ مغربی فیشن کے خلاف شاعری کو استعمال کرکے طنزیہ و مزاحیہ شعر گوئی کی رویات کو پروان چڑھایا۔ اَودھ پنچ کے مزاح گو شاعروں کے قافلہ سالار اکبر حسین اکبر الہٰ آبادی تھے جنھوں نے طنزیہ و مزاحیہ شاعر کو مقصد کے طور پر استعمال کیا۔ ان کے علاوہ ستم ظریف تر بھون ناتھ ہجر، سید محمد آزاد، عبد الغفار شہباز، احمد علی شوق جیسے مزاح گو شعرا اودھ پنچ کے حلقہ میں شامل تھے۔ منشی سجاد حسین نے بہترین ظریفانہ ادب تخلیق کیا۔ اس ضمن میں "طرحدار لونڈی، حاجی بغلول" اور "احمق الدین" ان کی بہترین تصانیف ہیں۔

اُردو کا پہلا دستیاب نثری کارنامہ "سب رس" کو قرار دیا جاتا ہے۔ جس میں ملا وجہی نے کہیں کہیں ایک دو لفظوں کے استعمال یا قافیہ پیمائی سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے صاحب بی بی غلام، مصری بادام پھر طویل داستانوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ روایت فارسی کے توسط سے اُردو میں داخل ہوئی اور بیشتر فارسی داستانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اس زمانے میں داستانیں محفلوں میں سنائی جاتی تھیں۔ اور داستان گو کیلئے یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ سامعین کی دلچسپی برقرار رکھنے کیلئے کہیں کہیں مزاح سے بھی کام لے۔ چنانچہ "داستان امیر حمزہ، داستان طلسم ہوشربا اور داستان الف لیلہ" وغیرہ میں جابجا عیاروں کی کارگزاری سامعین کو ہنسنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ خصوصاً عمر عیار کا کردار مزاح کا بہترین نمونہ تھا۔ داستانوں کے بعد اُردو میں ناول نگاری جیسی

صنف کا آغاز ہوا اور ڈپٹی نذیر احمد نے "مراۃ العروس" لکھ کر اُردو میں ناول کو روشناس کرایا۔ ناول نگاری میں بھی طنز و مزاح کے عناصر دیکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ عناصر غالب رجحان کی صورت میں نہیں بلکہ قصہ کے ذیلی روپ میں اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "توبتہ النصوح" میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اُردو ناول نگاری میں طنز و مزاح کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح "ابن الوقت" ناول میں بھی طنز و مزاح کی کاٹ محسوس کی جاسکتی ہے۔ ناول میں طنز و مزاح پیش کرنے والوں میں "پنڈت رتن ناتھ سرشار" کا نام اہم ہے جنھوں نے اُردو کے ضخیم ناول "فسانہ آزاد" میں دو ایسے اہم کردار پیش کئے جن کے ذریعہ ناول میں طنز و مزاح کے فروغ کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس ناول میں "میاں خوجی اور میاں آزاد" کے کردار واضح طور پر نثر میں طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

اُردو نثر کے تحقیقی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں افسانوی نثر داستانوں کی شکل میں تھی۔ جس کے بعد ناول کی صنف وجود میں آئی۔ پھر رفتہ رفتہ افسانے کی صنف کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے بعد ڈرامہ اور ناولٹ جیسی اضاف بھی منظر عام پر آئیں۔ اُردو کی طبع زاد داستانوں اور ترجمہ شدہ داستانوں میں اگر طنز و مزاح سے بھرپور کردار یا اظہار کے دوران طنز و مزاح کی خصوصیت دکھائی دیتی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف یا داستان گو قصے کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتا تھا اور اسی لئے اس میں کبھی مضحک کردار اور کبھی واقعات کے ذریعہ طنز و ظرافت کے عناصر پیدا کئے جاتے تھے۔ خطوط غالب میں بے شمار مثالیں ایسی موجود ہیں، جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ ایسی مخصوص فضا تیار کی ہے جس سے مزاح نگاری کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ غالب کی نثر میں استعارہ، ذو معنی الفاظ، تجنیس اور تجاہل عارفانہ کے ذریعہ مزاح کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس خاص انداز سے مزاح کی خصوصیت اور کیفیت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ غالب کی زبان اور ان کے انداز بیان میں موجود تخلیقی حسیت بھی مزاح کے انداز کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

برصغیر میں علمی، ادبی، سماجی، معاشی اور اخلاقی میدان میں جس شخصیت نے سب سے زیادہ کارہائے نمایاں سر انجام دیے وہ سر سید احمد خان ہیں۔ اُردو زبان و ادب کے "عناصر خمسہ" میں سے چار شخصیات کا براہ راست تعلق سر سید یا سر سید کی تحریک علی گڑھ سے ہے۔ ان معروف شخصیات میں سر سید کے علاوہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد شامل ہیں۔ جبکہ مولانا محمد حسین آزاد بھی اُسی عہد کی معروف ادبی شخصیت ہیں۔ اُن کا نام بھی

اُردو کے عناصر خمسہ میں شامل ہے مگر وہ تحریک علی گڑھ سے براہ راست وابستہ نہیں تھے۔ اُردو ادب میں مضمون نگاری، ناول نگاری، سیرت نگاری، تنقید، تاریخ نگاری اور انشائیہ وغیرہ کے آغاز وارتقا میں سرسید کی تحریک علی گڑھ کو اولیت حاصل ہے۔ تحریک علی گڑھ اگرچہ ایک سنجیدہ، حقیقت پسند اور عقلیت پسند تحریک تھی لیکن اس تحریک سے وابستہ ادبا کی تحریروں کے بغور مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ طنز و مزاح کا عنصر بھی اس تحریک سے وابستہ ادبا کے ہاں موجود رہا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے روحِ رواں سرسید کی بعض تحریروں میں طنز کے لطیف نشتر کے علاوہ مزاح کے نمونے بھی موجود ہیں۔ "حیات جاوید" میں حالی سرسید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "مرنے سے چار برس پہلے جب کہ انھوں نے تیسری بار تہذیب الاخلاق جاری کیا، اس کے اشتہار کے ساتھ جو انھوں نے ایک چھوٹا سا آرٹیکل بطور تمہید لکھا تھا اس کے آخر میں لکھتے ہیں۔ ہمارا دل کیسا ہی ٹوٹا ہوا ہو مگر امید ہے کہ آپ کا تہذیب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا نہ ہو گا تو بُرا بھی نہ ہو گا اور اگر وہ مکاتباتِ دلچسپ بھی تہذیب الاخلاق میں چھپنے لگے۔ جو ہم میں اور نواب محسن الملک مولوی مہدی علی میں بعض مسائل کی نسبت ہونے والے ہیں اور جن سے قصہ آدم یاد آجائے گا اور کبھی سید احمد کو حکم ملے گا کہ مہدی علی کو سجدہ کر اور کبھی مہدی علی کو حکم ہو گا کہ سیّد احمد کو سجدہ کرو، تب تہذیب الاخلاق نہایت ہی دلچسپ ہو جائے گا اور خدا نہ کرے کہ ان دونوں میں سے کوئی یہ کہے کہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین !"۔(1) (الطاف حسین حالی، حیات جاوید، 1901ء)

ایک بار شبلی اور سید ممتاز علی سرسید احمد خان کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ اسی وقت سرسید کا ایک بہت ضروری کاغذ گم ہو گیا اور وہ اسے بے حد تلاش کر رہے تھے۔ اتفاقاً شبلی کو وہ کاغذ الگ پڑا دکھائی دیا۔ شبلی نے اس کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تاکہ سرسید کو تھوڑا پریشان کیا جائے مگر سرسید کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ شبلی نے اس کاغذ کو ہاتھ کے نیچے دبا رکھا ہے تو دیکھیے سرسید کا اندازِ بیان جس سے ان کے مزاح کی شگفتگی کا پتہ چلتا ہے:

> "بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے، شیطان اسے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت مولانا! ذرا دیکھیے، کہیں میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں؟"۔(2)
> (محمد اسماعیل، اُردو ادیبوں کے دلچسپ لطائف، مشمولہ: طنز و مزاح نمبر، 1959ء)

ان واقعات سے سر سید کی حاضر جوابی حس مزاح، خود پر ہنسنے کا حوصلہ اور شوخی و ظرافت ظاہر ہوتی ہے جو ان کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے۔ حالاں کہ سر سید نے جن موضوعات کا انتخاب کیا تھا وہ انتہائی سنجیدہ اور متین تھے اس لیے ان کے مضامین میں شوخی و ظرافت کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ سر سید نے قوم کی اصلاح کے لیے مضامین لکھے، تقریریں کیں، کتابیں تصنیف کیں اور انگریزوں سے مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔ سنجیدہ موضوعات پر سر سید نے جو مضامین لکھے ان میں ان کا اسلوب منطقی، استدلالی اور تشریحی رہا جو موضوع کی مناسبت سے ناگزیر تھا۔ مگر بعض موقعوں پر انھوں نے دلچسپ پیرائے میں نہایت شگفتہ انداز بیان بھی اختیار کیا ہے۔ انھوں نے مکالماتی اور ڈرامائی انداز بیان بھی اختیار کیا۔ اس طرح ان کے مضامین میں انشائیے کا رنگ بھی در آیا۔ بحث و تکرار، امید کی خوشی، امید، وحشیانہ نیکی سراب حیات، وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

سر سید کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں میں ان کا مضمون "بحث و تکرار" اہمیت کا حامل ہے۔ سر سید نے اس مضمون میں تہذیب کے دائرے میں رہ کر اختلاف رائے اور بحث و مباحثہ کرنے پر زور دیا ہے۔ اس مضمون میں کتوں کی مثال اور ان کی فطرت و عادت اور نفسیات کو پیش نظر رکھا گیا ہے جن کا کام آوارہ گردی، بلا سبب بھونکنا، ایک دوسرے کو کاٹنا ہی ہے۔ سر سید نے اس جانور کا انتخاب بڑی ہوشمندی سے کیا، ان کی نفسیات کا باریکی سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور پھر معاشرے میں اسی طرز پر جینے والے افراد کی مماثلت دیکھ کر اس کی عمدہ تطبیق کی۔ یہاں ان کا مقصد معاشرے کے اس طرح کے افراد کی اصلاح ہے مگر اس میں بھرپور طنز بھی ہے۔ اس مضمون کے ابتدائی جملے دیکھیے:

> "جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور غیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور کا ٹینٹوا اس کے جبڑے

میں،اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر جھنجھوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا "۔(3)(سر سید احمد خان، تہذیب الاخلاق،11290ھ)

سر سید احمد خان کے خطوط کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بے تکلفی ، بے ساختگی ، طنز و ظرافت اور شوخی کی عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں جو انداز تحریر اختیار کیا تھا، وہ نہایت انوکھا اور دلچسپ تھا۔ بے تکلفی اور برجستگی اپنی انتہائی حدوں کو چھورہی تھی۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔ غالب کے خطوط اتنے نجی ہوتے ہیں کہ غالب کی زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے، نیز ماحول اور تہذیبی ، سیاسی ، سماجی صورت حال اور خود غالب کی معاشی حالت کا اندازہ ہوتا ہے, مگر سر سید عام طور سے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ وہ قوموں کے عروج وزوال پر تبصرہ کرتے ہیں، سیاسی ، سماجی اور مذہبی ادبی امور کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مگر جب ان کی ذات سے متعلق کوئی سوال ہوتا ہے یا بحث ہوتی ہے تو ان کا سنجیدہ اسلوب خود بہ خود ظریفانہ ہو جاتا ہے اور طنز کی لہریں کبھی خود پر کبھی سامنے والے پر نظر آنے لگتی ہیں مثلاً ایک جگہ گردن مروڑی ہوئی مرغی کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے سفر لندن کے دوران کھائی تھی۔ بے جھجک سارا واقعہ لکھ دیتے ہیں، کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے اس خط میں ظرافت بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے۔ جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے۔ ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز پر چھوڑے، نہ زمین پر چھوڑے۔ نہ رات کو الگ ہو ۔ نہ دن کو الگ ہو۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈر کرتا۔ میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں نہ روایت شاذہ سے۔ ...... والی مصر کے ساتھ بعض علمائے مصر بھی تھے۔ سب انگریزوں کے ساتھ غیر ذبح کیے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے"۔(4)(سر سید احمد خان، مکتوبات سر سید،1959ء)

شبلی نعمانی کا شمار سر سید کے رفقا میں ہوتا ہے۔ سر سید سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ سر سید کی رفاقت کی وجہ سے ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا لیکن شبلی نعمانی کی تربیت چونکہ خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے سر سید سے نظریاتی سطح پر ان کا اختلاف بھی رہا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط تھا اور ملک میں

بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ نئی ترقیوں اور نئے علوم کی سرسید تحریک نے پُر زور حمایت کی تھی جب کہ روایت پرستوں نے اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھالیا تھا۔ اس طرح مناظرے کی سی صورت ابھر آئی تھی۔ شبلی کا اپنا ایک خاص موقف تھا اور اپنی تحریروں میں وہ اس کا اظہار بھی کرتے رہے تھے۔ ان کی تحریروں کے امتیازی اوصاف میں جوش بیانی، خطابت اور حسن کاری کے علاوہ طنز اور شگفتگی بھی موجود ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے انشاپرداز ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

"لطیف طنزیہ نظمیں لکھنے کا سہرا علامہ مرحوم کے سر ہے" ۔(5) (رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، 1973ء)

جنگ بلقان کے دوران سر آغا خاں نے ترکوں کو ایشیا چھوڑ دینے کا مشورہ دیا جس سے مسلمانوں کے وقار کو گہرا صدمہ پہنچا تو شبلی نے اس کے جواب میں نظم لکھی جو ان کے طنز کی بہترین مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتار الم؟
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد — پاؤں پھیلا کے پڑے چین سے سوؤ گے چہ غم؟
نظر آجائے گی بیکاری آلات جدید — جب کہ تم وادیِ تاتار میں رکھو گے قدم(6)

(شبلی نعمانی، کلیات شبلی، س ن)

سرسید کے قائم کردہ علی گڑھ کالج کو جب یونیورسٹی کا درجہ ملا تو اس کے نام کے سلسلے میں مسلمانوں اور انگریز حکومت کے درمیان تنازعہ پیدا ہو گیا۔ مسلمان یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی رکھنا چاہتے تھے اور حکومت علی گڑھ یونیورسٹی رکھنا چاہتی تھی۔ حکومت کا رویہ نہایت سخت تھا جس کی وجہ سے عام مسلمانوں میں زیادہ جوش تھا لیکن دانش گاہ کی انتظامیہ کو عام مسلمانوں کی یہ دخل اندازی پسند نہیں تھی۔ اس موضوع پر شبلی نے متعدد طنزیہ نظمیں لکھیں۔ ان میں سے ایک نظم "تقسیم عمل مقدسینِ علی گڑھ کا قوم پر عتاب" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ان ابلہانِ قوم کو سمجھائے یہ کوئی — عالم کے کاروبار کا اک انتظام ہے
جس کی بنا تمام ہے تقسیم کار پر — یعنی ہر ایک شخص کا ایک خاص کام ہے

تھا قوم کا جو فرض وہ تھا بس آگے مقدسین علی گڑھ کا کام
عطائے زر ہے(7)
(شبلی نعمانی، کلیات شبلی، س ن)

درجہ بالا اشعار شبلی کے سیاسی، سماجی، اصلاحی اور قومی موقف کا ثبوت پیش کرتے ہیں جن میں سیاست دانوں کی خامیاں، ملی رہنماؤں کے تعصب، انگریزوں کے ظلم و جبر تعلیم یافتہ افراد کی نا اہلی، ہندوستان کی سماجی و سیاسی صورت حال وغیرہ پر طنزیہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان تمام مقامات پر طنز کی تلخی شدت اختیار کر لیتی ہے اور بیان کی قوت ایک نوع کا زور پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح کئی دوسری طنزیہ نظموں میں عصری حالات پر گہرا طنز ملتا ہے۔ ان نظموں میں "یونیورسٹی والحاق، بمبئی کی وفادار انجمن، جنگ زرگری درس گاہ وفا کا حال" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ایک دفعہ وہ بندوق کی گولی سے اپنی ٹانگ کو زخمی کر بیٹھے تھے اور الہٰ آباد میں موجود تھے تو اکبر الہ آبادی نے انہیں کھانے پر بلایا۔ دعوت نامہ چند اشعار پر مشتمل تھا۔ جواب میں شبلی نے بھی منظوم معذرت نامہ ارسال کیا۔ اس معذرت نامہ سے ان کی خوش طبعی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اکبر نے لکھا تھا:

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی بس صاف یہ ہے بھائی شبلی
تکلیف فرماؤ آج کی رات کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر ہو جو کچھ دال دلیا سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

شبلی نعمانی نے جواباً عرض کیا:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ملال ہے لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں(8)

(شبلی نعمانی، کلیات شبلی، س ن)

شبلی کے طنزیہ اسلوب کا مطالعہ کرنے کے بعد دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل لفظوں کے بدل اور ہیر پھیر سے وہ شوخی اور ظرافت کے عناصر پیدا کرتے ہیں۔ دوم ان کا ایجاز و اختصار جن میں ٹھوس پن کے ساتھ زہرناکی اور شدت ہوتی ہے۔ یہ صورت بر محل مصرعے یا شعر یا ایک آدھے جملے کی شکل میں نظر آتی ہے، جب وہ کسی شخص سے متعلق گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کے مکاتیب میں بھی نظر آتی ہے۔ ایک شاعر کی غزلیں موصول ہونے کے بعد وہ باقی غزلوں کی فرمائش اس طرح کرتے ہیں:

"باقی غزلیں بھی بھیجئے، اور اگر دیوان پورا کرنا منظور ہے تو وصال کی تاریخ ٹالنے آجایئے ورنہ وہ ناسور بند ہو جائے گا"۔(9)(شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، مرتبہ:سید سلیمان ندوی ،1966ء)

تحریک علی گڑھ سے وابستہ الطاف حسین حالی بھی قوم کی زبوں حالی سے پریشان تھے۔ شبلی نے جنگ آزادی کا ہنگامہ نہیں دیکھا تھا۔ جب کہ حالی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا مشاہدہ بھی کیا تھا اور تجربہ بھی۔ وہ اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ حالی کا شمار سر سید کے رفقا میں ہوتا ہے۔ وہ سر سید کے ادبی ترجمان بھی تھے، انھوں نے ہر قدم پر سر سید کا ساتھ دیا۔ حالی کی نثر عام طور سے سنجیدہ اور متین ہوتی ہے اس کے باجود ان کے یہاں ایک طرح کی لطافت، نفاست اور شگفتگی بھی ہے۔ ان کی زندگی مشکلات میں گزری اس کے باوجود ان کے یہاں ہنس ہنس کر جینے کا فلسفہ ملتا ہے۔ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور لطف اندوز بھی۔ ان کے مضمون "اخبار نویسی اور اس کے فرائض" کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

"ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جاکر کہا کہ مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو نہ ہی بہت بڑے قد کا جب رستہ صاف ہو تو اچھلتا کودتا چلے اور جب راستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے نہ دیوار سے اڑتا چلے نہ گنجان درختوں میں سوار کو لے کر گھس جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے صبر کرے اور پیٹ بھروا دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے اور جب تھان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے۔ سوداگر نے جواب دیا۔ چند روز صبر کرو۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا"۔(10)(الطاف حسین حالی، مقالات حالی،1957ء)

حالی جب مسلمانوں کے زوال کا نقشہ کھینچتے ہیں تو اُن کا کرب ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ قوم کو بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے کی غرض سے طنزیہ انداز اپناتے ہیں۔ حالی کی نظموں اور قطعات میں صرف طنز ہی ہے بلکہ انھوں نے مزاحیہ اور ظریفانہ عناصر سے بھی کام لیا ہے:

لیجئے بھیک دوڑ کر گر ہے گداگری کا یہ
جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے
یہی ہے اصل اکتساب ہو جتنے سب سے مستفید
زک ملے یا سزا ملے درس ملے ادب ملے (11)!

(سفارش حسین، انتخاب حالی، 1948ء)

حالی کی نثر و نظم دونوں میں طنزیہ اور مزاحیہ عناصر موجود ہیں۔ حالی نے واعظ پر طنز کیا ہے کہ تم اگر لوگوں پر کفر کے فتوے لگاتے رہے تو یہ جنت خالی ہو جائے گی اور دوزخ بھر جائے گی۔ اسی طرح وہ نام نہاد اماموں اور خطیبوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ اب کوئی رہنمائی کرنے والا نہیں رہا بلکہ یہ بزرگ لوگوں کو گمراہ کرنے اور اپنی جیب بھرنے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ حالی صرف قوم پر ہی نہیں بلکہ قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے خود اپنے آپ کو بھی طنز و تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں اور اس طرح زندہ دلی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ حالی شیخ، واعظ اور محتسب کو یوں نشانہ بناتے ہیں:

کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
کیوں خُلد کو ویران کرواتے ہیں آپ
چھیڑ کر واعظ کو حالی خُلد سے
بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ(12)

(سفارش حسین، انتخاب حالی، 1948ء)

نذیر احمد کا شمار سرسید کے معاصرین اور رفقائے خاص میں ہوتا ہے۔ وہ سرسید کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں تھے لیکن ان کی تعلیمی خدمات اور اصلاحی کوششوں کے قدردان تھے۔ نذیر احمد نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ناول نگاری کو ذریعہ بنایا۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمان بدحال تھے۔ اخلاقی برائیاں، سُستی، جہالت اور تعصب وغیرہ ان کی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔ اپنے پہلے ناول "مراۃ العروس" میں نذیر احمد نے اس دور کی عورتوں کی

جہالت اور توہم پرستی کو طنز کے پیرایے میں بیان کیا ہے اور ان کی اصلاح کے لیے دلچسپ اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ نذیر احمد نے اپنے ناول "توبۃ النصوح" میں اولاد کی اخلاقی اور مذہبی تربیت پر زور دیتے ہوئے اس طبقے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو اولاد کو پال کر بڑا تو کر دیتے ہیں لیکن ان کی مناسب تربیت نہیں کرتے۔ "توبتہ النصوح" کے مشہور کردار "کلیم" کے ذریعہ نذیر احمد نے اس طبقے پر طنز کیا ہے:

> "کلیم میں اس قسم کے بیہودہ عیوب تھے جن میں آج کل کے نوجوان شریف زادے کثرت سے مبتلا پائے جاتے ہیں یعنی عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار رکھنا، پہروں چڑھے سو کر اٹھے، ضرورتوں سے فارغ ہو کر آئینہ کی تلاوت شروع ہوئی تو دوپہر کر دیا۔ بال ٹھکانے لگے اور مانگ درست ہوئی اور کہیں اصلاح کا زور مخصوص ہوا تو سارا دن گزر کپڑے بدلنے کی نوبت پہنچی۔ ٹوپی قالب سے اتر کر آئی تو سر پیٹ لیا مگر ایسی احتیاط سے کہ بال نہ بگڑیں"۔(13)(ڈپٹی نذیر احمد، توبۃ النصوح،1983ء)

مرزا ظاہر دار بیگ اس سماج کی نمائندگی کرتا ہے جو اوپر سے چمکتی دمکتی دکھائی دیتی ہے لیکن اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ اس ناول کا ایک کردار کلیم جب اپنے باپ کی دینداری کی باتوں سے تنگ آکر اپنے دوست ظاہر دار بیگ کے پاس جاتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ ظاہر دار بیگ کی تمام باتیں جھوٹی تھیں۔ ظاہر دار بیگ ایک وقت کا کھانا بھی اپنے دوست کلیم کو نہیں کھلا پاتا۔ وہ اُسے ایک پرانی مسجد میں بلاتا ہے جہاں پر چمگاڈریں تھیں، روشنی کا کوئی انتظام نہیں اور کھانے کے لیے تھوڑے چنے خرید لاتا ہے اور چنے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دیتا ہے۔ مرزا ظاہر دار بیگ کی زبان ملاحظہ ہو:

> "یار ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے بُھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا ۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس کا اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا"۔(14)(ڈپٹی نذیر احمد، توبۃ النصوح،1983ء)

نذیر احمد نے ظاہر دار بیگ کے ذریعہ اس عہد کی ناہمواریوں کو پیش کیا ہے۔ اردو کے مشہور مزاحیہ کرداروں میں "مرزا ظاہر دار بیگ" کا بھی شمار ہوتا ہے۔ نذیر احمد نے عام طور سے واقعات کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا بہترین نمونہ "ابن الوقت" کا وہ حصہ ہے جہاں نذیر احمد نے ابن الوقت کو نوبل صاحب کے

ساتھ کھانا کھاتے ہوئے دکھایا ہے۔ ابن الوقت کھانا کھا رہے ہیں اور چھری کانٹے کا استعمال کرتے ہوئے ابن الوقت نہایت مضحکہ خیز نظر آتا ہے:

> "اس نے بے تمیزی سے بے تمیزی یہ کی کہ داہنے ہاتھ میں کانٹا لیا اور بائیں ہاتھ میں چھری۔ نوبل صاحب کے بتانے سے کانٹا بائیں ہاتھ میں لیا تو چھری کو اس زور سے کانٹے پر ریت دیا کہ چھری کی ساری باڑھ جھڑ پڑی۔ خدمت گار نے میز پر سے دوسری چھری اٹھا کر دی۔ شاید آلو ہی تھا کہ اس کو کاٹنے لگا تو اچھل کر بڑی۔ خیر ہو گئی کہ ٹیبل کلاتھ (دستر خوان) پر گرا پھر جب کسی چیز کو کانٹے میں پرو کر منہ میں لے جانا چاہتا تھا، ہمیشہ نشانہ خطا کرتا اور جب تک باری باری سے ناک اور تھوڑی اور گلے یعنی تمام چہرے کو داغ دار نہیں کر لیتا، کوئی لقمہ منہ میں نہیں لے جا سکتا"۔(15)(ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، کتابی دنیا، دہلی، 2003ء)

درج بالا اقتباس میں نذیر احمد نے مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کو نشانہ بنایا ہے۔ نذیر احمد نے ابن الوقت کی نقل و حرکت کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے۔ یہ ان کی مزاح نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ نذیر احمد نے اس نوجوان طبقے پر طنز کیا ہے جو پوری طرح مغربیت کو اپنا لیتا ہے اور اپنے کو بھول جاتا ہے۔ نذیر احمد کے دیگر ناولوں میں بھی طنز و مزاح کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ مزاح انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ تفریح طبع، دل لگی اور شگفتگی کے بغیر انسان سنجیدگی کا مرقع نظر آئے گا۔ اس طرح کی زندگی انسان طویل عرصے تک نہیں گزار سکتا۔ مزاح نگار نہایت شگفتہ انداز میں زندگی کی ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات اور احساسات کے سہارے جس دنیا کی تخلیق کرتا ہے اس میں حسن اور توانائی ہوتی ہے۔ تحریک علی گڑھ کے تحت سرسید اور اُن کے رفقائے کار شبلی، حالی، اور نذیر احمد نے اپنی تحریروں میں شگفتگی بیان کے جو نمونے پیش کئے۔ اُن سے نہ صرف اس عہد کے بانیان مستفید ہوئے بلکہ اردو ادب کی اصناف کا بھی قابل قدر ذخیرہ جمع ہو گیا۔

تحریک علی گڑھ کے تحت شگفتہ بیانی کا یہ سلسلہ سرسید کے دور کے بعد بھی جاری رہا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں میں شعری وسائل سے بہت کم کام لیا ہے۔ انھوں نے نثر کو نثر کے انداز میں لکھا۔ وہ آسان زبان استعمال کرتے ہیں اور حسب ضرورت طنز و مزاح سے کام لیتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی ایک ہجویہ مثنوی بعنوان "برج "ماہنامہ صبا میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے یہ مثنوی اس وقت لکھی جب اورنگ آباد کالج کے اسٹاف کے لوگوں نے جو ان کے دوستوں میں سے تھے، انجمن ترقی اردو کے چندے کے لیے انھیں اورنگ آباد بلایا۔ جب عبدالحق وہاں پہنچے

تو ان کے دوست برج کھیلنے میں مصروف تھے جس وجہ سے ان کی خاطر خواہ مدد نہ کر سکے اور چندہ جمع نہیں ہو پایا۔ اس واقعہ کے پس منظر میں مولوی عبد الحق نے ایک طنزیہ مثنوی "برج" لکھی۔ اس میں برج کے کھیل کے مضر نتائج مثلاً ازدواجی زندگی میں پیدا ہونے والی تلخیاں، میاں بیوی کی لڑائی وغیرہ کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ مثال دیکھیے:

ہمارے اک محب رسیا برج کے — دوانے ہیں شب و روز اس کے پیچھے
نہ گھر کی کچھ خبر اور نہ در کی — برج سے دل لگی آٹھوں پہر کی
اگر آئے کبھی گھر میں تو ایسے — مسافر آسرا میں اترے جیسے
ترستے رہتے ہیں صورت کو بچے — نہیں یہ پھوٹے منہ سے بات کرتے(16)

(مولوی عبد الحق، ہجویہ برج، مشمولہ: ماہنامہ صبا، نومبر 1963ء)

سجاد انصاری بھی تحریک علی گڑھ کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں۔ "محبت کی ماہیت نفسی" میں محبت کرنے والے اور محبت کے دھوکے میں آنے والوں پر یوں طنز کرتے:

"حسن خیال ہو یا حسن واقعات، اس میں کشش اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ طلسم راز رہے۔ خود محبت کرنے والا ابتدا میں اسی طلسمی فضا میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی قدسیانہ عنصر ہے، اسی پاک محبت میں ہے۔ یہ وہ لفظ ہے جسے انسان نے دوسروں سے زیادہ خود اپنے جذبات کو دھوکہ دینے کے لیے وضع کیا ہے۔ ابتدائے محبت میں انسان خود اپنے کو ھوکہ دیتا ہے اس کی انتہا یہ ہے کہ دوسرے بھی اس دھوکے میں آجاتے ہیں"۔(17)(سجاد انصاری، محشر خیال، 1941ء)

سجاد انصاری نے سماجی کمزوریوں اور ناہمواریوں کو پیش کرتے ہوئے تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی نظر ڈالی ہے۔ بظاہر سجاد انصاری کی تحریروں میں تلخی محسوس ہوتی ہے لیکن یہی کڑواپن انھیں منفرد بناتا ہے۔ سجاد انصاری کے طنز کی عمدہ مثال ان کے مضمون "حقیقت عریاں" سے بھی ملتی ہے۔ اس میں انھوں نے عورت کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے اُسے دنیا کا اہم فریب بتایا ہے:

" آدم اگر جنت میں تنہا رہتے، ان کا ہر لمحہ حقائق کی جستجو میں صرف ہوتا۔ فرشتوں کا گروہ ان کے سامنے تھا۔ حقائق شیطنت ساری فضا میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان پر عبادت و ریاضت کے وہ فرائض بھی عاید نہیں کیے گئے تھے، جن کی وجہ سے فرشتوں کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی حقیقت پر غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان حالات میں یہ کچھ بعید نہ تھا کہ مصالح خداوندی کا سارا طلسم ان کے سامنے ٹوٹ جاتا، اور وہ اپنی ہستی کو کسی حقیقت میں محو کر دیتے انھیں خطرات کو روکنے کے لیے کارکناں قضاو قدرے، پیکر نسوانی کی تخلیق کی، اور اس میں وہ تمام کششیں بھر دیں جو انسان کے ہر خیال اور ہر گل کو مغلوب کر سکتی ہیں "۔(18)(سجاد انصاری، محشر خیال، 1941ء)

تحریک علی گڑھ نے جہاں مسلمانان برصغیر کی زندگی کے تمام میدانوں میں رہنمائی کی وہیں انہوں نے افراد معاشرہ کے ذوق تسکین کو بھی سامنے رکھا۔ اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے علی گڑھ سے منسلک محققین، ادبا اور شعرا نے اپنی تحریروں میں ظرافت وطنز و مزاح کو بھی شامل کیا۔ جس سے معاشرے کے سلگتے مسائل کو اجاگر کرنے میں معاونت ملی۔

حوالہ جات

1۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، نامی پریس، کانپور، 1901ء، ص:453
2۔ محمد اسماعیل، اُردو ادیبوں کے دلچسپ لطائف، مشمولہ: طنز و مزاح نمبر، ادارہ فروغ اُردو، 1959ء، ص:910
3۔ سر سید احمد خان، تہذیب الاخلاق، 11290ھ، ص:25
4۔ سر سید احمد خان، مکتوبات سر سید، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1959ء، ص:58
5۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، مکتبہ جامعہ لمٹڈ، نئی دہلی، 1973ء، ص:155
6۔ شبلی نعمانی، کلیات شبلی، معارف پریس، اعظم گڑھ، س ن، ص:63
7۔ ایضاً، ص:۹۱
8۔ ایضاً، ص:۱۲۰

9۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف اعظم گڑھ، 1966ء، ص:129

10۔ الطاف حسین حالی، مقالات حالی، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، 1957ء، ص:187

11۔ سفارش حسین، انتخاب حالی، مکتبہ جامعہ لمٹڈ، دہلی، 1948ء، ص:104

12۔ ایضاً، ص:105

13۔ ڈپٹی نذیر احمد، توبۃ النصوح، اترپردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، 1983ء، ص:215

14۔ ایضاً، ص:178

15۔ ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، کتابی دنیا، دہلی، 2003ء، ص:84

16۔ مولوی عبد الحق، ہجویہ برج، مشمولہ: ماہنامہ صبا، مدیر: سلیمان اریب، حیدر آباد دکن، نومبر 1963ء، ص:5

17۔ سجاد انصاری، محشر خیال، مرتبہ: خواجہ منظور حسین،، جید برقی پریس، دہلی، 1941ء، ص:40

18۔ ایضاً: ص:53